ابن رشد کے سیاسی افکار[1]

ترجمہ - محمد سرور

یہ ہماری غلطی ہوگی اگر ہم یہ سمجھیں کہ ابن رشد صرف ارسطو کے فلسفہ کی بڑے شارحین ہی میں سے ایک ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ افلاطون کی مشہور تصنیف "جمہوریہ" کے شارحین میں سے بھی ہے۔ اگرچہ وہ افلاطون کے سیاسی افکار کا پورا احصاء نہیں کر سکا۔

ابن رشد علم السیاست کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، جیسا کہ علم طب کی کیفیت ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ارسطو کا علم الاخلاق نظری اعتبار سے اس کا جزو اول ہوگا۔ اور افلاطون کی جمہوریت عملی لحاظ سے اس کا جزو ثانی اور یہ کہ علم السیاست عملی فلسفہ کا ایک جزو لا یتجزی ہے۔ باقی رہے عملی فلسفہ کے دو دوسرے اجزا، تو وہ علم الاخلاق اور علم الاقتصاد ہیں۔ اس کی فلسفے کی یہ تقسیم یونانی افکار و آرا سے مستفاد ہے،

ابن رشد نے جمہوریہ افلاطون کی جو شرح کی ہے، اسے آج اس زمانے میں جو چیز اہم اور مفید بناتی ہے، وہ یہ ہے کہ اپنی اس شرح میں اس کا دوسری شرحوں میں جو عام معمول ہے وہ اس سے الگ راہ اختیار کرتا ہے، بلکہ وہ اس میں اپنے فلسفی مسلک کے خلاف جاتا ہے

---

[1] یہ مضمون عربی مجلہ "البیّنة" سے ماخوذ ہے، جسے خاص اس مجلہ کے لئے کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر "ا۔ ج، روزنطال" نے لکھا۔ "البیّنة" مراکش کے شہر "الرباط" سے شائع ہوتا ہے۔ (مدیر)

اس سلسلے میں ابن رشد کے سامنے جمہوریۂ افلاطون کا وہ نسخہ تھا، جو اس تک عربی متن میں پہنچا تھا۔ چنانچہ وہ اس کی روشنی میں اسلامی سلطنت کا تجزیہ کرتا ہے اور خاص طور سے وہ اپنی ہم عہد دو سلطنتوں یعنی سلطنت مرابطین اور سلطنت موحدین کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔ وہ اپنے اس تجزیہ و تنقید کی بنیاد اس تجربے پر رکھتا ہے، جو اسے قرطبہ میں محکمہ قضا میں بحیثیت مالکی قاضی کے عہدے پر فائز ہونے سے حاصل ہوا تھا۔

ہم اگر یہاں یہ کہیں، تو راہِ صواب سے زیادہ دور نہیں ہوں گے کہ موحدین اور مرابطین کے عہد حکومت میں بھی قاضی کے عہدے کی وہی حیثیت باقی تھی، جو ان حکومتوں سے پہلے دور میں تھی۔ اور اس سلسلے میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ابن رشد کا دادا اپنے زمانے میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھا اس دور میں قاضی کا صرف یہ کام نہیں ہوتا تھا کہ وہ بس فیصلے اور احکام صادر کر دیا کرے، بلکہ اس کے ذمے سول ایڈمنسٹریشن (ادارہ مدنیہ) بھی ہوتا تھا۔ ظاہر ہے ابن رشد کے پاس منصب قضا سنبھالنے کی وجہ سے سیاسی زندگی کے تمام شعبوں میں بڑا وسیع اور پائدار تجربہ جمع ہو گیا ہوگا اور سلطنت کے نظم و نسق اور اسلامی معاشرے کے اسرار و رموز کے بارے میں بھی اس کی بڑی گہری نظر ہو گئی ہوگی۔ اس کے علاوہ افلاطون کی طرح ابن رشد کی بھی یہ رائے تھی کہ سلطنت کی عنان اقتدار فلسفیوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے اور اگر یہ ناقابل عمل ہو تو فلسفیوں کو چاہیئے کہ نظم و نسق کی اصلاح اور بہتری کے لئے اپنے عقلی معیاروں کے مطابق اس پر تنقید کرتے رہیں۔ فلسفی کا مقام سیاسی گروہوں کی باہمی آویزش اور آپس کے متناقض خصوصی مفادات سے بلند و بالا ہے اور اسے ان چیزوں سے الگ رہنا چاہیئے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ عقل کو حاکم مان کر پوری بہادری اور آزادی سے اپنی مقصود و مطلوب حقیقت کی خدمت کرے۔ اور عقل وہ گراں بہا عطیہ ہے، جو اللہ تعالٰے نے انسان کو بخشا ہے اس ضمن میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ابن رشد ایک متدین فلسفی ہے۔

ابن رشد نے افلاطون کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ریاست و مملکت کے پس منظر میں حقیقت پر بحث کی ہے۔ یہاں اس کی تو گنجائش نہیں کہ اس کے سیاسی افکار و آراء کی اس کے

پورے فلسفہ کی روشنی میں شرح کی جائے۔ لیکن ابن رشد نے اس سلسلہ میں افلاطون کی جو شرح کی ہے میری بحث اس کی صرف دو بنیادی باتوں پر محدود رہے گی۔ ایک ریاست میں قانون الٰہی اور قانون انسانی کی حیثیت، اور دوسرے اپنے عہد کی اسلامی سلطنت پر اس کی تنقید اور خاص طور سے مسلمانوں کے ہاں عورتوں کی جو حالت تھی، اس کے بارے میں ابن رشد کی شدید ناپسندیدگی۔

سب سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ابن رشد جو قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کے بڑے فلسفیوں میں سے سب سے آخری ہے، اس کی عظیم فکری سرگرمیوں میں فلسفے کا کیا مقام تھا؟ اس ضمن میں ضروری ہے کہ ابن رشد کے عہد میں فلسفہ اور فلسفیوں کو جس بری نظر سے دیکھا جاتا تھا، ہم اسے جانیں، کیونکہ اس سے اس فلسفی کو اچھی طرح سمجھا جاسکے گا۔ ابن رشد سے پہلے امام الغزالی نے فلسفے پر جو حملے کئے تھے اس سے اسلامی فلسفہ کی حیثیت مدافعانہ ہوگئی تھی۔ امام الغزالی کی کتاب تھافتہ الفلاسفہ کے جواب میں ابن رشد نے تھافتہ التھافتہ نام سے جو کتاب لکھی تھی خواہ وہ کتنی بھی کامیاب رہی ہو، لیکن اس سے امام الغزالی ہی کے موقف کو تقویت پہنچی اور اس کے بعد اسلامی فلسفہ ایک خاص نہج پر چل پڑا۔ امام الغزالی جیسے بڑے متکلم فلسفی نے فلسفہ پر جو حملہ کیا اور ابن رشد کو اس کا دفاع کرنا پڑا، تو اس کی وجہ سے آزاد فکر ایک محدود دائرے میں محصور ہو کر رہ گیا۔ یہاں ہمیں اس حقیقت کا اظہار کردینا چاہیئے کہ ابن رشد دین اسلام کا معتقد ہے اور وہ پوری طمانیت سے شریعت کی بالادستی اور فلسفی بحث وجدل کے دائرے کی تحدید کو قبول کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ لازمی ہے کہ دین اسلام کو ماننے والے خواہ وہ فلسفی ہوں یا متکلم یا عوام الناس، اسلامی معتقدات پر یقین رکھیں۔ نیز یہ معتقدات فلسفیوں کی بحثوں سے جو محض دلیل و برہان پر اعتماد کرتے ہیں، ماوراء ہیں۔

دینی معتقدات اور فلسفہ کے بارے میں ابن رشد کا جو موقف ہے، وہ دراصل نتیجہ ہے ان حملوں کا جو امام الغزالی کی طرف سے فلسفہ پر کئے گئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس بات کے حق میں بھی تھا کہ اپنے اس موقف کے دائرے کے اندر رہ کر فلسفیانہ دلائل اور عقلی براہین سے دین کی تائید کرے۔ ابن رشد نظریہ نبوت کے بارے میں تدبیر کا اہم خیال تھا اور اس ضمن میں ان مسلم فلسفیوں کے نظریات سے جو افلاطون سے متاثر تھے اور نبوت کو سرچشمہ عقل و فعال

کا سونا سمجھتے تھے، اسے اختلاف تھا۔

علماء اور فقہا کے ساتھ ابن رشد کی جو بحثیں ہوئیں، جب ہم ان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ابن رشد کے ہاں جگہ بہ جگہ ابہام اور تناقض ملتا ہے۔ لیکن ہمیں اس بارے میں زیادہ تعجب نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ آخر ابن رشد موحدین کی سلطنت کا ایک عہدے دار تھا اور گو موحدین کا فلسفیانہ افکار کی طرف بھی کچھ رجحان تھا، لیکن وہ تھے اہل سنت والجماعت کے مسلک کے علمبردار اور شرع کے خالص اسلام کے داعی۔ بہر حال میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ابن رشد پہلے مسلمان تھا اور اس کے بعد فلسفی اور یہ کوئی راز نہیں کہ وحی اور عقل اور قانون الٰہی اور قانون انسانی کے درمیان جو کہ عقل کی پیداوار ہے، مطابقت کرنا اگر محال نہیں، تو مشکل ضرور ہے اور میرے خیال میں قرون وسطیٰ میں کوئی بھی ایسا مفکر نہیں گزرا، خواہ وہ مسلمان ہو، یا یہودی یا مسیحی، جو ان دونوں میں پوری طرح مطابقت کر سکا ہو۔ اس سلسلے میں ابن رشد ایمان کی فوقیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اس پر وہ مُصر ہے کہ شریعت کے بارے میں دین اور فلسفہ دونوں کے مقاصد ایک ہی ہیں، اور یہ کہ ایک فلسفی ہی عقلی لحاظ سے وحی کی تشریح کر سکتا ہے۔ اور یہ کام فقہا کے بس کا نہیں۔ کیونکہ ان کے پاس واضح دلیل (الحجۃ البیّنۃ) نہیں ہوتی اور اس معاملے میں منطقی دلیل ناکافی رہتی ہے، بلکہ یہ عوام الناس کے لئے خطرناک ہے۔

ابن رشد شریعت کا دفاع کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ شریعت ایک واضح حکم ہے جس پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور شریعت اور فلسفہ میں اساسی فرق یہ ہے کہ فلسفہ کی تلقین صرف منتخب لوگوں کو کی جاتی ہے۔ درآں حالیکہ دین عوام الناس کو سکھایا جاتا ہے لیکن ہر دو کے پیش نظر ہے ایک ہی حقیقت۔ یہاں ہم یہ اشارہ کر دیں کہ ابن رشد کی طرف غلط طور پر دوئی اور ثنویت منسوب کی گئی ہے۔ یہ تصور دراصل اس کے بعض اطالوی متبعین کا ہے ابن رشد کا نہیں۔ ابن رشد کے نزدیک وحی بھی عقل کی طرح حقیقت کو بیان کرتی ہے۔ لیکن وحی کا درجہ مقدم ہے کیونکہ وہ اللہ کی حکمت مطلقہ کی پیداوار ہے اور عقل کا مصدر و منبع انسان ہے، جو خطا سے خالی نہیں۔ اس ضمن میں

یہ ملحوظ رہے کہ ابن رشد انسانوں کے تین طبقے منوانے پر بہت زور دیتا ہے۔ ایک فلسفی دوسرے متکلمین اور تیسرے عوام الناس۔ اس کے نزدیک یہ تینوں کے تینوں طبقے اپنی عقلی استعداد کے مطابق اللہ کے وجود، رسالت اور آخرت کا جہاں کہ انسان کو اپنے اعمال کی جزا و سزا ملے گی، ادراک کر سکتے ہیں، لیکن جہاں تک امور عبادت کا تعلق ہے، ان کا دائرہ عقلی تشریح سے باہر ہے۔ ابن رشد اس خاص موقف میں ہمیں امام الغزالی کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔

موجودہ بحث میں جو چیز ہمارے لئے اہم ہے وہ ہے ابن رشد کے سیاسی فکر اور دین میں باہمی تعلق۔ افلاطون کا فلسفہ اس کے شاگردوں کی شرح کے ساتھ مسلمانوں میں داخل ہوا۔ اب سیاست میں اہل یونان اور اسلام دونوں کی آرا کا مرجع واساس عدل کا اصول تھا۔ اس اساس کی بدولت قرون وسطی میں مسلمان اہل فکر کو افلاطون اور ارسطو کے افکار و آرا کو قبول کرنے میں بڑی مدد ملی۔ البتہ ایمان اور عقل، قانون الٰہی و شریعت اور قانون انسانی کی باہمی کشمکش نے ان کے ہاں ایک نازک صورت اختیار کرلی تھی۔ ایک طرف افلاطون تھا، جو یونانی ہیئتِ سیاسیہ یا ریاست کو مثالی و آئیڈیل قرار دیتا تھا۔ اور دوسری طرف ابن رشد ہے جو اس ریاست کو دین سے خارج ہونے کے باوجود ایک بہترین ریاست سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک مثالی و آئیڈیل ریاست ایک اسلامی ہی ہے جس کی بنا شریعت پر ہے اور وہ نبوت سے اپنے اصول اخذ کرتی ہے اور وہ یقیناً افلاطون کے قوانین سے جو عقل انسانی پر مبنی ہیں فائق ہیں۔ باوجود اس کے کہ دونوں نظاموں میں بنیادی اختلافات تھے، پھر بھی سیاسی نقطہ نظر میں یونانی اور اسلامی افکار میں باہم امتزاج ہوا اور اس طرح فلسفہ واقعی سے ذریعہ وحی اور عقل میں اتصال بروئے کار آیا۔ جس کا دائرہ آگے چل کر فلسفہ نظری تک جا پہنچا اور پھر اس فلسفہ نظری کو دینی معتقدات کی شرح میں استعمال کیا جانے لگا۔ ابن رشد افلاطون سے اس معاملے میں متفق ہے کہ ریاست اور مملکت خواہ وہ یونانی ہو یا اسلامی، اس کے لئے معتقدات کا ہونا ضروری ہے۔

ابن رشد کے نزدیک قانون کی آخری غایت اللہ اور حقیقت کی معرفت اور اس زندگی کے

کے بعد دوسری زندگی میں سعادت (نیک بختی) اور شقاوت (بدبختی) پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہمارے اعمال کو سعادت کی طرف ہماری رہنمائی کرنی چاہیئے اور شقاوت سے ہمیں بچنا چاہیئے یونانیوں کے ہاں علم السیاست کی آخری غائت سعادت ہے۔ اور اس سلسلے میں علم السیاست کا ایک مقصد "خیر عام" ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک سعادت مشتمل ہے غور و تامل اور عمل خیر ہر دو پر اسی ضمن میں خاص اس مسئلے پر الفارابی نے کتاب "تحصیل السعادۃ" کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ چنانچہ سیاست اور دین اور قانونِ افلاطون اور قانون اسلام یعنی شریعت کے درمیان یہی رشتہ ہے۔ ریاست کی اساس قانون ہے اور ایک اسلامی ریاست میں فلسفی پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ یقینی برہان و دلیل سے قانون الٰہی کی شرح کرے اور یہ کہ حقیقت کا اظہار صرف یقینی برہان و دلیل ہی سے ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ ملحوظ رہے کہ ابن رشد شریعت اور قانون میں جیسا کہ افلاطون نے آخر الذکر کی تحدید کی ہے، بڑا واضح فرق بتاتا ہے۔ اور ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے، جیسے کہ اوپر بیان ہوا، وہ شریعت کی اوّلیت کا قائل ہے۔ نیز قانون الٰہی کے بارے میں اس کا جو ایجابی موقف ہے، اس کی وجہ سے اس کے لئے اس قانون (الٰہی) اور دوسرے مختلف قوانین میں جن کا ذکر ارسطو نے کیا ہے، مقابلہ کرنا آسان ہو گیا ہے۔ باقی رہی "شریعت" تو وہ اس کے نزدیک اسلامی ریاست یعنی خلفائے راشدین کے عہد کی خلافت کا ایک کامل قانون ہے اور یہ اسلامی ریاست افلاطون کی مثالی و آئیڈیل ریاست سے فائق تر ہے۔

چونکہ یہ خلافت قانون الٰہی کا جس کی کہ رسول کریم صلعم پر وحی کی گئی ہے، سیاسی مظہر ہے اس لئے ایک مسلمان کا فرمانروائے ریاست سے یہ مطالبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اس میں نبوت کے اوصاف ہوں۔ اس معاملے میں ابن رشد کا الفارابی اور ابن سینا سے اختلاف ہے۔ ابن رشد کے نزدیک امام صاحب شریعت رسولؐ کا خلیفہ ہے۔ اور خلافت کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں رسولؐ کے قانون کی پوری پوری تطبیق ہوئی۔ اور یہ کہ رسولؐ صاحبِ معجزات سے زیادہ صاحب شریعت تھے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولؐ پر جو قانون بذریعہ وحی اتارا ہے، اس میں انسان کی اس زندگی کا بھی خیال رکھا گیا ہے

اور آخرت کا بھی، لیکن آخرت کا خیال زیادہ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ یہ قانون انسان کے لئے دو اچھائیوں (حسنۃ فی الدنیا اور حسنۃ فی الآخرۃ) کا حامل ہے۔ اس کے برعکس ابن رشد کی نظر میں افلاطون کا قانون صرف اس دنیا کی اچھائی کا خیال رکھتا ہے ابن رشد کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح کے قانون فلسفیوں نے ایک مختصر سے منتخب گروہ کے لئے، جس میں خود ان کا شمار ہوتا ہے، وضع کئے ہیں تاکہ وہ دوسروں سے پہلے خود زیادہ سے زیادہ سعادت حاصل کریں۔ باقی رہے عوام الناس، تو وہ اس لئے جان مارتے اور جفائیں جھیلتے ہیں تاکہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ "خیر اعلیٰ" کا جو انسانی مقصد ہے، وہ اسے حاصل کریں اس سلسلے میں ابن رشد افلاطون پر اس بنا پر سخت تنقید کرتا ہے کہ اس نے عوام الناس کو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن ایک مسلمان کی نظر میں تمام مومنین کی سلامتی کی بڑی اہمیت ہے۔ ابن رشد انسانوں میں کوئی تمیز نہیں کرتا، اس کے نزدیک قانون الٰہی ان تمام لوگوں کے لئے جو اپنے درجوں کے مطابق اس کا اتباع کرتے ہیں، امن کی کفالت کرتا ہے دینی نقطہ نظر سے سعادت کے باب میں لوگوں میں جو اختلاف ہوتا ہے تو وہ ان کے درجات اور مراتب کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ ان کی شخصی حیثیتوں کی بنا پر۔ اللہ کے سامنے سب انسان برابر ہیں۔ اور وہ ان کا ان کے فضائل (اعمال) کی بنا پر، نہ کہ ان کے انکار کی بنا پر محاسبہ کرے گا۔ ظاہر ہے یہ موقف فلسفہ کا نہیں، بلکہ ایمان کا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک طرف ابن رشد عرفان کے بلند مرتبے پر فائز لوگوں میں سے جو افراد علم الغیب کا سراغ لگانے میں کوشاں ہیں اور وہ اپنے ذہن رسا اور عقلی غور و تعمق کے ذریعہ اللہ کی حقیقی اور گہری معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان سے مثالی سعادت کا وعدہ کرتا ہے اور دوسری طرف بحیثیت ایک مسلمان کے اس کا اس پر بھی اصرار ہے کہ شریعت سب کی سلامتی کی کفیل ہے۔

ہم ایک بار پھر اسلامی ریاست کی مثالی خلافت کے موضوع کو لیتے ہیں ابن رشد اس خلافت کی اہمیت کو سمجھتا ہے اور بحیثیت اہل سنت والجماعت میں ہونے کے وہ اسے مثالی سمجھتا ہے لیکن ایک فلسفی کی طرح وہ اس خلافت اور افلاطون کی ریاست کے درمیان باوجود اس کے کہ دونوں میں بنیادی فرق ہے، موازنہ بھی کرتا ہے۔ اور ان کی روشنی میں وہ اپنے دور کی اسلامی

حکومت کا جائزہ لیتا ہے اور اس پر رائے زنی کرتا ہے۔ افلاطون نے اپنی کتاب میں مثالی ریاست کے علاوہ ناقص اور غیر کامل ریاستوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے بعد جو حکومتیں قائم ہوئیں وہ افلاطون کی غیر کامل ریاستوں سے ملتی جلتی ہیں ابن رشد نے مسلمانوں کی ان غیر کامل حکومتوں کا ذکر کرتے ہوئے الفارابی کی تعبیرات سے کام لیا ہے دراصل یہ الفارابی ہی تھا جس نے مسلمانوں کے ہاں افلاطون کی تعبیرات کو داخل کیا، لیکن ابن رشد الفارابی سے زیادہ باریک بین تھا اس نے حکومتوں کی جو قسمیں گنائی ہیں، وہ الفارابی سے زیادہ ہیں الفارابی نے افلاطون کی صرف چار ہی حکومتوں کے ذکر پر اقتصار کیا ہے، جو یہ ہیں۔

دیموقراطیہ (Democracy مطلق العنان حکومت (Autocratie)

چندسری حکومت "حکم العصبیۃ" (Oligarchy) مستبد حکومت (Tyrannie)

غرض اس طرح الفارابی نے مسلمانوں میں یونانی سیاسی فلسفہ داخل کیا۔

ابن رشد ابن خلدون کی طرح جو اس کے بعد ہوا ہے، بادشاہت کے نظام کو ایک مخلوط نظام سمجھتا ہے۔ بے شک اس نظام بادشاہت میں نظری و عملی اعتبار سے خلافت اسلامیہ کے اساسی عناصر محفوظ رہے، لیکن بادشاہ کی اپنے اقتدار اور شخصی حکومت کو برقرار رکھنے کی جو خواہش ہوتی تھی اس کی وجہ سے اس نظام میں کافی ملاوٹ پیدا ہو گئی۔ غرض ابن رشد نے مغرب (الجزائر و مراکش) میں قائم شدہ اسلامی سلطنت کو خلافت اسلامیہ اور افلاطون کی مثالی ریاست اور اس کی دوسری چار ناقص و غیر کامل ریاستوں کے معیار سے جانچا ہے۔ میرے نزدیک ابن رشد کے مغرب کی اسلامی سلطنت کو افلاطونی معیاروں سے جانچنے کے معنی یہ تھے کہ وہ اس کا قائل تھا کہ افلاطون جس سے ارسطو نے اپنے اہم نظریات اخذ کئے ہیں، وہ سیاست کے مقاصد، ریاست کے بنیادی اصولوں، اس کی خرابیوں اور پھر وہ جس طرح بتدریج زوال پذیر ہو کر ناقص و غیر کامل حکومتوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جیسا کہ خود ایک فرد انسانی اور نوع انسانی کا حال ہے، ان امور پہ غائر نظر رکھتا تھا۔ چنانچہ یہاں ہم ابن رشد مسلمان کو ابن رشد فلسفی سے اتفاق کرتے ہوئے پاتے ہیں۔

ابن رشد نے اُن اشعار پر جن سے غیر مستحسن جذبات بھڑک سکتے ہیں، تنقید کی ہے، اسی طرح وہ عہد جاہلی کے اشعار کو دینی اور اخلاقی لحاظ سے ناپسند کرتا ہے اور اس دور کے قصائد میں جو سیاسی مفاسد تھے ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ابن رشد کا شاعری کی اس طرح مخالفت کرتا قدرتی طور پر افلاطون کے اثرات کا پتہ دیتا ہے۔

عورت کے معاملے میں ابن رشد کی جو رائے ہے، وہ صاف طور سے افلاطون سے مستنبط ہے ابن رشد نے بڑی جرأت اور نہایت عجیب طریقے سے اپنی اس رائے کو مسلمانوں کے ہاں اُسوقت عورت کی جو حیثیت تھی، اس پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ افلاطون کی طرح شہری زندگی کے فرائض و واجبات میں عورت کی شرکت کو پسند کرتا ہے۔ اس کی یہ رائے اس زمانے کے مسلمان معاشرے کے عام معمول کے خلاف ہے، جہاں مرد اور عورت کے اختلاط کو بُرا سمجھا جاتا تھا، اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے۔

"ہماری ان سلطنتوں میں عورتوں کی استعداد و قابلیت کا کوئی اظہار نہیں ہوتا کیونکہ ان سے یہاں سوائے نسل و تناسل کے اور کوئی کام ہی نہیں لیا گیا۔ ان کی زندگی اپنے خاوندوں کے اشارے پر موقوف ہے اور وہ سوائے بچوں کو جننے انہیں دودھ پلانے اور ان کو پالنے کے کسی اور کام کے قابل نہیں سمجھی جاتیں، لیکن اس کی وجہ سے ان کی دوسری سرگرمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان سلطنتوں کے بانجھ پن کے اسباب میں سے ایک سبب عورتوں کا اپنے خاوندوں پر بار ہونا ہے ہمارے ہاں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد دو چند ہے اور اس کے باوجود ہم انہیں سوت کاتنے اور کپڑا بُننے جیسے معمولی کاموں کے سوائے دوسرے ضروری کام سکھانا ضروری نہیں سمجھتے۔"

ابن رشد نے یہ جو لکھا ہے، وہ درحقیقت اس کی اپنی ہم عہد سلطنت موحدین پر تنقید ہے اس کے علاوہ جس طرح افلاطون سوفسطائیوں پر تنقید کیا کرتا تھا، اسی طرح متکلمین ابن رشد کی تنقید کا نشانہ بنے۔ وہ انہیں سلطنت کے لئے ایک خطرہ قرار دیتا تھا۔

ابن رشد نے اپنے پیش رو فلسفی ابن باجہ سے "مدینہ امامیہ" کی اصطلاح مستعار لی ہے جس

کا اطلاق وہ ایک ناقص و غیر کامل ریاست پر کرتا ہے۔ ابن رشد کے نزدیک یہ "مدینہ امامیہ" اس کے عہد کی سلطنت موحدین ہے، جو افلاطون کی تعبیر کے مطابق ڈیموقراطی نظام سے منتقل ہو کر استبدادی نظام کی حامل ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں ابن رشد کہتا ہے۔

"پہلے اموال عوام کے ہاتھ میں تھے پھر وہ حکمراں خاندانوں کے پاس جمع ہو گئے
یعنی رعایا کا کام یہ رہ گیا کہ وہ بادشاہ کے شخصی مفادات کو پورا کرتی رہے۔"

معلوم ہوتا ہے یہ اشارہ ان امور حکومت کی طرف ہے جو موحدین کے فرمانروا عبدالمومن کے بعد اس کے جانشین اور بیٹے ابو یعقوب یوسف کے عہد میں رونما ہو رہے تھے ایک اور جگہ ابن رشد نے اس صورت حال پر کہ کس طرح خلافت نے بعد میں بادشاہت کی شکل اختیار کر لی، تنقید کی ہے اسی ضمن میں وہ مرابطین اور موحدین کے عہد میں جو تبدیلیاں ہوئیں، ان کا موازنہ کرتا ہے مثال کے طور پر یوسف بن تاشفین کے عہد میں نظام حکومت شریعت پر مبنی تھا، یعنی وہ خلافت سے ملتا جلتا تھا پھر اس کے بعد اس کے بیٹے کے عہد میں وہ بادشاہت میں بدل گیا۔ اور اس کے پوتے کے عہد میں ہوا و ہوس بن کر رہ گیا۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا، اس میں ہم نے دیکھا کہ ابن رشد نے خلافت اور افلاطون کی پیش کردہ ریاست میں موازنہ کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ یونانی فلسفی کے نقش قدم پر چلا ہے اور دوران بحث وہ بتاتا ہے کہ طریقہ ہائے حکومت کی تبدیلی کا افراد کی طبیعت پر کیا اثر پڑا مرابطین کے ہاں ڈیمو-قراطی نظام حکومت ۵۴۰ھ میں استبداد میں تبدیل ہوا ہے اور یہ تاریخ اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ ابن رشد نے اس کے پس منظر میں اس صورت حال پر بحث کی ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتا ہے "تمہارے لئے یہ ممکن ہے کہ ۵۴۰ھ کے بعد فرمانرواؤں اور ارکان سلطنت کے اخلاق اور ان کی عادات میں جو تغیر رونما ہوا، اسے دیکھو۔ جب وہ نظام جس کے زیر اثر ان کی نشو و نما ہوئی تھی وہ کمزور ہو گیا۔ تو طبعاً ان کے اخلاق بھی خراب ہو گئے، ان میں جو لوگ تعلیمات دینی پر کاربند تھے وہ تو اپنے اخلاق کو بحال رکھنے میں کامیاب رہے لیکن یہ ان میں بہت کم تھے"

کیا ابن رشد کی یہ رائے افلاطون کے ان اقوال سے نہیں ملتی، جو اس نے اپنی مثالی و آئیڈیل ریاست کے زوال کے بارے میں کہے ہیں۔

ابن رشد کے سیاسی فلسفے میں دین اسلام کی بحیثیت ایک پیغام وحی ہونے کے جو مرکزی اہمیت ہے، اس کی وضاحت کے لئے ہم نے اب تک جو مثالیں دی ہیں، وہ کافی ہیں۔ اسی طرح ان مثالوں سے اس کی بھی پوری وضاحت ہوگئی ہے کہ ابن رشد نے اپنی ہم عصر اسلامی سلطنتوں پر کس جرائت سے تنقید کی ہے جو اس کے نظریات کے تحت اسلامی اساس کی ضد تھیں ابن رشد کے یہ نظریات افلاطون اور ارسطو سے مستفاد تھے چنانچہ اس نے جس طرح افلاطون کے افکار اور اس کے نظام ہائے حکومت کو مرابطین اور موحدین کی سلطنتوں پر منطبق کیا ہے، وہ ہمارے اس خیال کی پوری تائید کرتا ہے[1]

---

[1] میں نے اس مقالے میں ایک عبرانی زبان میں لکھے ہوئے مسودہ سے، جو جمہوریہ افلاطون کی ابن رشد کی تصنیف کردہ شرح ہے، استفادہ کیا ہے۔ یہ عبرانی مسودہ میں نے شائع کردیا ہے اس کا اصل عربی متن معلوم ہوتا ہے، ضائع ہوگیا ہے۔ اس عبرانی مسودے کا مترجم اسپین کے شہر مرسیلیا کا ایک یہودی ہے اور اس نے یہ ترجمہ سنہ ۱۳۲۲ء میں مکمل کیا ہے۔ اسی یہودی نے ابن رشد نے افلاطون کی "کتاب الاخلاق" کی جو شرح کی تھی، اس کا بھی عبرانی میں ترجمہ کیا ہے۔ (مصنف)

"ابن رشد نے یورپ کے اقلیم ذہن پر چار سو سال سے زائد عرصے تک حکمرانی کی۔ اور اطالوی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بھی اسی کے ہاتھوں سے رکھی۔"